© rasailojaraid.com

روس میں پان ترکزم اور اسلام[1]

(۳)

تلخیص و ترجمہ

عبدالرؤف فطرت

بخارا کے لبرلوں کے مسلمہ لیڈر عبدالرؤف فطرت کی کتاب "مناظرہ"، بخارا کے "جدیدیین" کی ایک لحاظ سے منشور بن گئی۔ اس کتاب میں فطرت نے دینی مدارس کے اپنے سابق استادوں پر یہ الزام لگایا کہ انہوں نے اسلامی دنیا کو ثقافتی اور ٹیکنیکل ترقی سے علیحدہ رکھ کر اور اس طرح اسے ذہنی و روحانی جمود میں مبتلا کر کے درحقیقت اسلام کی قوت کو نقصان پہنچایا ہے۔ وہ لکھتا ہے:-

"وہ ضرب جو تم نے ہمارے دین پر لگائی ہے، ذرا اس کا خیال کرو۔ تم نے جس غلط طریقے سے شرع محمدی کو پیش کیا، اس سے ہم پر کیا کیا مصیبتیں ٹوٹیں۔ واقعہ یہ ہے کہ مسلمانوں کی عظمت کو گھن تمہارے ہی ہاتھوں سے لگا اور تمہاری ہی وجہ سے عنقریب اسلام پورے زوال میں آجائے گا۔ تم نے ترقی میں رکاوٹ بن کر مسلمانوں پر جہالت کا ایک موٹا پردہ ڈال دیا ہے۔"

فطرت نے مسلمانوں کی فوجی طاقت کی کمزوری کا ذمہ دار بھی علماء اور مدرسوں کے استادوں کو ٹھیرایا۔ وہ لکھتا ہے:- "تم نے ہمارے اس ملک کے لئے اسلحہ کو صرف خنجروں، تلواروں، کمانوں اور تیروں تک محدود کر دیا اور ہمیں توپوں، رائفل، بم، ڈائنامیٹ اور دوسرے اسلحہ بنانے سے روک دیا۔ تم نے مسلمانوں کو سنیوں، شیعوں، زیدیوں اور وہابیوں میں تقسیم کر کے ایک کو دوسرے کا جانی دشمن بنا دیا اور تم نے قرآن مجید کو اپنی خواہشات کے تابع کر لیا ہے۔" فطرت صرف علماء ہی پر نہیں برسا، اس نے امیر بخارا کی بھی خوب خبر لی۔

فطرت اور اس کے "جدیدی" ساتھیوں کی تحریروں میں روس کی دشمنی اور پان اسلامزم کی حمایت

---

[1] یہ مضمون ہارورڈ (امریکہ) یونیورسٹی سے شائع شدہ ایک انگریزی کتاب سے ماخوذ ہے۔ (مدیر)

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کے بھی رجحانات ملتے ہیں وہ یورپ کے ہاتھوں عالم اسلام کی تباہی پر غم و غصہ کا اظہار کرتے تھے اور اس کا مجرم اصلاح و ترقی کے مخالف علماء اور بخارا کے حکمرانوں کو گردانتے تھے کہ یہ وسط ایشیا کو عیسائیت کے غلبے سے محفوظ نہ رکھ سکے۔ اسی ضمن میں فطرت یہ بھی یاد دلاتا ہے کہ حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے جہاد کو فرض قرار دیا تھا، اور یہ کہ نئی تعلیم اور نئے خیالات سے مسلمان اس قابل ہو سکیں گے کہ دہ اسلام کے دفاع اور کفار کے ہاتھوں سے مادر وطن کو آزادی دلانے کے لئے بہتر سے بہتر اسلحہ بنا سکیں۔

عبدالرؤف فطرت کی ان کوششوں کی وجہ سے بخارا میں بھی سیاسی جدوجہد تیز ہو گئی اور جب نئے امیر نے اپنے وعدے پورے نہ کئے تو یہ تحریک "زیر زمین" چلی گئی اور اس نے نظام حکومت کی اصلاح کے ساتھ ساتھ جہالت، توہمات اور مذہبی تعصب کو ختم کرنے کی کوششوں کا بھی آغاز کر دیا۔ بخارا کے "جدیدیین" کے عثمانی ترکی کے "نوجوان ترکوں" سے بڑے گہرے روابط تھے، اور انہی کی تقلید میں انہوں نے بھی اپنے لئے "نوجوان بخاری" کا نام اختیار کیا۔ بخارا سے متصل خیوا تھا وہاں بھی بیسویں صدی کے شروع سے "جدیدیین" کے پاؤں جم گئے تھے۔ وہاں کے لبرلوں کو اس سلسلے میں خان خیوا کے دو مشیروں اسلام خواجہ اور حسین بیگ سے بڑی مدد ملی۔ خیوا میں بخارا کی طرح نئے سکولوں کا زیادہ چرچا نہ ہو سکا، اور جہاں تک وہاں کی سیاسیات کا تعلق تھا وہ ازبکوں اور ترکمانوں کے باہمی نزاع کی شکار رہی۔

مختصراً مصنف کے الفاظ میں۔

پہلی جنگ عظیم (۱۹۱۴ء) اور ۱۹۱۷ء کے انقلاب روس سے کچھ قبل تک وسط ایشیا والوں کی زندگی اور ان کے ذہن پر بدستور اسلام کو غلبہ حاصل رہا۔ نیز ایک طرف اگر زار حکومت کی طرف سے ازبکوں اور تاجکوں کو روسی ثقافت کے رنگ میں رنگنے کی جیسے جو روسی کوششیں ہوئیں وہ نسبتاً ناکام رہیں۔ تو دوسری طرف ان کے ہاں ایک لبرل قومی تحریک کے فروغ میں قدامت پسند طاقتیں سد راہ بنیں۔ اس ضمن میں "جدیدیین" کو شروع شروع میں جو کامیابی ہوئی تو وہ زیادہ تر (دونگا اور یورال کے) تاتاریوں کی وجہ سے تھی، اور اس کا دائرہ اثر بھی انہی علاقوں تک محدود رہا، جو روسی نظم و نسق کے تحت تھے یہاں کہ روسی استعمار کے کارندے بالقصد یا بغیر کسی مقصد کے مسلمان مذہبی تشدد پسندوں کے انتقام سے ان لبرل "جدیدیین" کو بچاتے تھے۔ لیکن جب بھی اور جہاں بھی وسط ایشیا میں ترقی خواہ (پروگریسو) قومی تحریک

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کا قدامت پسندوں سے کھلم کھلا مقابلہ ہوا، تو اول الذکر وسط ایشیائی معاشرے کی ہئیتِ ظاہری اور اس کی روح پر غلبہ پانے میں بہت کمزور ثابت ہوئی اس کے علاوہ وسط ایشیائیوں میں جو نئی نئی ترکی قومیت کی لہر ابھری تھی تو وہ اس بنا پر کوئی واضح شکل اختیار نہ کر سکی، کہ اس کے ذریعہ ترکی قومیت کے ساتھ ساتھ اسلام کی اصلاح اور اسے زندہ کرنے کی توقعات بھی کی جاتی تھیں۔

روسی آذربائیجان

روسی آذربائیجان میں، جو بحیرہ کیسپین سے متصل ہے، انیسویں صدی کے دوران ہونے والے ثقافتی و سیاسی تبدیلیوں میں سب سے نمایاں چیز یہ ہے کہ ایرانی اثر و نفوذ جو وہاں کئی صدیوں سے غالب تھا، ترکیت کی اس سے کش مکش ہوتی ہے۔ قسطنطنیہ میں ترکیت کو ایرانی اثرات سے پاک کرنے کی جو تحریک اٹھی تھی، وہ ترکی کے اندر اور باہر دونوں جگہ ترکوں کے قومی احیاء کی ایک مشترک خصوصیت بن گئی۔ اور روس کے تمام ترک علاقوں میں چونکہ آذربائیجان میں ایرانی اثر و نفوذ سب سے زیادہ اور قدیم زمانے سے تھا۔ اس لئے روسی آذربائیجان کے لئے اس نئی تحریک کی خاص اہمیت تھی۔ ایران میں صفویوں کے برسر اقتدار آنے سے ترکیت اور ایرانیت کی کش مکش نے سنیت اور شیعیت کی شکل اختیار کر لی تھی، چنانچہ ۱۹۱۶ء [illegible] آذربائیجان کی مسلم آبادی کا ۶۰ فیصدی حصہ شیعہ تھا۔

۱۸۰۴ء میں روسی فوجیں ادھر بڑھیں، اور ۱۸۱۳ء کے معاہدۂ گلستان کے تحت موجودہ آذربائیجان روسی سلطنت کا ایک حصہ بن گیا۔ روسی قبضے کے باوجود ان علاقوں کی نظم و نسق کی زبان ۱۸۴۰ء تک زیادہ تر فارسی رہی۔ مقامی حکام یا تو خود ایرانی تھے، یا وہ ایسے آذربائیجانی اعلیٰ طبقوں میں سے تھے، جو فارسی بولتے تھے۔ اس طرح ۱۸۷۰ء تک عدالتوں میں فارسی زبان مستعمل ہوتی رہی۔ شیعہ علماء جن کے ہاتھ میں دینی مدارس تھے اور عدالتوں کا کنٹرول تھا، وہ ایرانی اثر و نفوذ کے سب سے بڑے محافظ تھے اور اونچے طبقوں اور ادب کی زبان تو فارسی تھی ہی۔

باکو

۱۸۵۹ء میں ایک آذربائیجانی ڈرامہ نویس فتح علی اخوندزادہ نے آذربائیجانی زبان میں ڈرامے لکھے۔ اس نے اپنے اہل وطن کو روسی اور مغربی یورپی ثقافت سے واقفیت پیدا کرنے کی دعوت دی۔ بلکہ اس نے یہ بھی تجویز کی کہ آذربائیجانی زبان عربی رسم الخط کے بجائے روسی لاطینی حروف میں لکھی جائے۔ اخوندزادہ نے شیعہ علماء کے مذہبی تعصب اور تنگ دلی کے خلاف بھی جدوجہد کی، ۱۸۷۵ء میں ایک اسکول ٹیچر نے آذربائیجانی زبان میں سب سے پہلا اخبا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

نکالا اس اخبار میں بھی شیعہ علماء کی تنگ دلی اور تعصب کے خلاف لکھا جاتا تھا۔

یہی وہ زمانہ ہے جب (۱۸۷۰ء - ۱۸۸۳ء) باکو میں تیل کے ذخیرے ملے اور وہ جلد ہی ایک بین الاقوامی صنعتی مرکز بن گیا۔ ۱۸۸۳ء میں وہاں تک ریل بھی پہنچ گئی۔ اور اب نہ صرف آذربائیجان کی روسی منڈیوں اور مغربی یورپ سے بلکہ استنبول سے بھی آمد و رفت آسان ہوگئی اور اس کے ساتھ ساتھ آذربائیجان میں عثمانی ترکی اثر و نفوذ بڑھنے لگا۔

بیسویں صدی کی ابتدا میں آذربائیجان کے اعلیٰ اور تجارت پیشہ طبقوں میں سے ایک پڑھا لکھا گروہ، جو باکو کی نئی زندگی سے متاثر تھا، ابھرنے لگا۔ دانشوروں کے اس نئے گروہ کا رجحان شروع ہی سے پان اسلامزم اور ترکی قومیت کی طرف تھا، اسماعیل بے گسپرنسکی کے اخبار "ترجمان" نے آذربائیجانیوں کے اندر اسلامی اور ترک دنیا کا ایک حصہ ہونے کا احساس جو ایرانی اور شیعہ بالادستی کی وجہ سے عرصہ دراز سے دبا ہوا تھا، بیدار کر دیا تھا۔ ۱۹۰۶ء میں ایک مزاحیہ رسالہ "ملا نصیر الدین"[1] کے نام سے نکلا جس نے ایرانی اور شیعی روایات کے خلاف پھر اسی جد و جہد کو شروع کیا، جس کی طرح فتح علی اخوندزادہ پہلے ڈال چکا تھا۔

آذربائیجان میں لبرل خیالات اور ترکی قومیت کا پہلا داعی علی بے حسین زادہ تھا جس نے باکو اور پیٹرز برگ میں تعلیم پائی تھی۔ وہ ایک فعال سیاسی لیڈر بھی تھا اور با اثر اہل قلم بھی۔ وہ ۱۸۸۹ء میں ترکی گیا۔ جہاں نوجوان ترکوں سے اس کے روابط پیدا ہوئے ترکی کے زمانۂ قیام میں ترکی سیاسیات میں اس نے عملی حصہ بھی لیا۔ ۱۹۰۵ء کے بعد وہ واپس باکو آیا، اور وہاں سے "فیوضات" نام کا ایک ہفتہ وار اخبار نکالا، اسی کا ہمعصر ایک اور بڑا ممتاز اور حرکت و قوت سے بھرپور آذربائیجانی احمد بے آغا اوغلو تھا، جو پندرہ سال روس سے باہر رہ کر ۱۹۰۵ء میں باکو لوٹا حسین زادہ کی طرح اوغلو کی تعلیم بھی باکو اور پیٹرز برگ میں ہوئی تھی پھر وہ پیرس چلا گیا تھا۔ جہاں اس نے مشہور فرانسیسی مورخ ارنسٹ رینان اور بعض دوسرے مستشرقین کی شاگردی کی۔ رینان کے قومی اور سیاسی نظریوں نے جو قومیت کو نسلی شعور پر مبنی قرار دیتے تھے، اس نوجوان آذربائیجانی کے دل و دماغ پر بڑے گہرے اثرات ڈالے اور یہ آگے چل کر نہ صرف تمام ترکوں کو متحد کرنے کا ایک بڑا نقیب و داعی بنا، بلکہ اس نے تمام تورانی نسل کے لوگوں کو متحد کرنے کے لئے "پان تورانزم" کا تصور پیش کیا۔ اپنے دور کے دوسرے لبرلوں کی طرح اوغلو نے بھی علماء، اور بالخصوص شیعہ علماء کی سخت مخالفت کی، اور ان پر الزام لگایا کہ وہ عوام کی جہالت اور توہم پرستی سے غلط فائدہ

---

[1] مشرقِ قریب کے ملکوں میں ملا نصیر الدین کا وہی مزاحیہ کیریکٹر ہے جو ہمارے ہاں ملا دو پیازہ کا ہے۔ مدیر

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اٹھاتے ہیں اس کا کہنا تھا کہ مسلم ممالک کے افلاس کا سب سے بڑا سبب مسلمانوں کی ثقافتی اور تہذیبی سماجی زندگی پیران علماء کا تسلط ہے۔ آغا اوغلو نے مسلم معاشرے کی اصلاح اور مسلمان عورتوں کی آزادی کی بھی دعوت دی۔

ایک تیسرا شخص جو آذربائیجانیوں کی اس جدوجہد میں بڑا نمایاں تھا، علی بے مردادن ہے، یا یڈووکیٹ تھا۔ اور اس نے ۱۹۰۵ء میں روسی مسلمانوں کی مشہور جماعت "اتفاق" کے اجتماع کی صدارت کی تھی۔ وہ دوسری روسی پارلیمنٹ "ڈوما" میں مسلم گروپ کا لیڈر بھی رہ چکا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ یورپی تہذیب، مغربی استعمار اور جدید قومیت کے زیر اثر اسلامی دنیا لامحالہ متحد ہو کر رہے گی۔ ۱۹۱۸ء - ۲۰ ۱۹ء میں جمہوریہ آذربائیجان کی آزادی کے مختصر سے عرصے میں علی بے مردان اپنے ملک کے سب سے فعال سیاسی رہنماؤں میں سے تھا۔ اور بعد میں وہ جمہوریہ آذربائیجان کا صدر بھی بنا۔

۱۹۰۵ء سے ۱۹۰۸ء تک کے وقفے میں جب کہ روس میں قدرے آزادی تھی۔ آذربائیجان میں کافی اخبارات نکلے۔ جن میں سے بعض کے نام یہ ہیں :- ضیا۔ کشکول۔ ضیائے قفقاز۔ صدا۔ صدائے وطن۔ صدائے حق۔ صدائے قفقاز۔ حقیقت۔ اینی (جدید حکمت)۔ اقبال۔ معلومات۔ میزان۔ اور تجارت وغیرہ۔

روس کے تمام ترک علاقوں میں آذربائیجان ہی میں سب سے پہلے مسلمان عورتوں کو مساوی حقوق دینے کی تحریک شروع ہوئی تھی۔ ایک خاتون خدیجہ خانم نے "عشق" نام کا رسالہ نکالا۔ اسی طرح بعض اور ممتاز خواتین اس جدوجہد میں پیش پیش تھیں۔ سوائے مذہبی اخبارات کے، باقی تمام آذربائیجانی صحافت نے مسلمان عورتوں کی آزادی کی اس تحریک کی تائید کی تھی۔

باکو میں تیل کے ذخیروں کی وجہ سے آذربائیجان میں دوسری قوموں کے لوگ بھی آ گئے تھے۔ اور پھر مزدور تحریک بھی وہاں تھی۔ ۱۹۰۰ء کے بعد سوشل ڈیموکریٹس[1] کا اثر و نفوذ مزدور تحریک میں سرایت کر چکا تھا۔ اور اسی زمانے میں اسٹالین باکو میں اپنی انقلابی سرگرمیوں میں سرگرم کار تھا۔ ۱۹۰۴ء میں سوشل ڈیموکریٹس نے "ہمت" کے نام سے ایک مخصوص مسلمان گروپ کی تشکیل کی، جس کے لیڈر آذربائیجانی تھے۔ ۱۹۱۷ء کے انقلاب کے بعد ان میں سے ایک عزیزبیکوف باکو میں بالشویک سربراہ بنا، اور اس نے کاکیشیا کے علاقوں میں سوویت نظام کے نفاذ میں بڑا نمایاں حصہ لیا۔ آذربائیجان کے دانشوروں کے ایک گروہ کی ہمدردیاں استنبول کے ساتھ تھیں۔ اور جب ترکی میں اتحاد و ترقی کے نوجوان ترک برسر اقتدار آئے تو آذربائیجان میں پان ترکیت کا پروپیگنڈہ کافی تیز ہو گیا۔

---

[1] روس کی یہی پارٹی آگے چل کر بالشویک اور کمیونسٹ بنی (مدیر)

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مساوات پارٹی

باقاعدہ طور پر پہلی آذربائیجانی سیاسی پارٹی کہیں ۱۹۱۱ - ۱۹۱۲ء میں بن پائی۔ محمود امین سیلے رسول زادہ کی قیادت میں چند دانشور جمع ہوئے اور انہوں نے "مساوات" کے نام سے ایک زیرزمین (انڈرگراونڈ) بائیں بازو کی بوژوا پارٹی کی بنا رکھی۔ احمد بے آغا او غلو اور دوسرے بہت سے آذربائیجانو کی طرح رسول زادہ اپنی سیاسی زندگی کے شروع میں ترک نیشلسٹ سے زیادہ اتحاد اسلامی کا حامی ایک لبرل تھا۔ بعد میں اسٹالن کے ساتھ مل کر اس نے مسلمانوں کا ایک سوشل ڈیموکریٹ گروپ "ہمت" کے نام سے بنایا۔ اور باکو میں وہ روس کی زار حکومت کی مخالفانہ سرگرمیوں میں بھی شریک رہا۔ اس کے بعد وہ بھاگ کر ایران چلا گیا۔ اور وہاں اس نے شاہ ایران کی استبدادی حکومت کے خلاف تحریک میں حصہ لیا۔ جب ایرانی انقلاب ناکام ہوا تو وہ جان بچا کر استنبول پہنچ گیا۔ اور وہاں وہ نوجوان ترکوں میں جو برسر اقتدار آچکے تھے، شامل ہو گیا۔ رسول زادہ ترکی اور فارسی دونوں زبانوں کا مسلمہ ادیب تھا۔ چنانچہ ایران میں وہ ایرانی اخبارات میں مضمون نگاری کرتا رہا۔ اور استنبول میں ایک انتہا پسند ترکی قوم پرست اخبار میں جسے اس کے باکو کے اپنے ہم وطن اور رفیق کار احمد بے آغا اوغلو نے جاری کیا تھا۔ لکھنے لگا۔ ۱۹۱۰ء یا ۱۹۱۱ء میں وہ واپس باکو آیا، اور آتے ہی اس نے مقامی سیاسات میں بڑی سنتدی سے حصہ لینا شروع کر دیا۔

"مساوات" باوجود اپنے نام کے اور باوصف اس کے کہ اس کے قائم کرنے والے پہلے سوشل ڈیموکریٹس رہ چکے تھے۔ ایک سوشلسٹ پارٹی سے کہیں زیادہ ایک قوم پرست ترک یا پان اسلامزم کی ․می پارٹی تھی۔ پارٹی کے قیام کے وقت اس کا جو منشور شائع کیا گیا، اس میں "مساوات" کی مرکزی کمیٹی نے اس دور کا ذکر کیا تھا جب کہ صاحب اقبال مسلمانوں کا ایک ہاتھ پیکنگ کو چھوتا تھا"...... اور دوسرے ہاتھ سے انہوں نے یورپ کے دوسرے سرے پر الحمرا کو وجود بخشا تھا" اس منشور میں اس امر پر افسوس کا اظہار کیا گیا تھا کہ "ایشیا، افریقہ اور یورپ کے اتنے وسیع وعریض ملکوں پر حکمرانی کرنے کے بعد آج اسلام کے حصے بخرے ہو گئے ہیں۔" "مساوات" کے پروگرام کی بنیادی باتوں میں مساوات و برابری سے زیادہ مسلمانوں کو جن سے کہ ان کی مراد لامحالہ ترک تھے، متحد کرنے کا مسئلہ تھا، "مساوات" کے پروگرام کی بعض دفعات یہ ہیں :-

۱۔ تمام مسلمان قوموں کو بلا تمیز فرقہ و قوم متحد کرنا

۲۔ جو مسلمان ممالک غلام ہیں، ان کی آزادی کو بحال کرنا

۳۔ جو مسلمان ملک اپنی آزادی کی حفاظت یا اپنی آزادی کے حصول کے لئے جدوجہد کر رہے ہیں ان کی اخلاقی و مادی مدد کرنا۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

۴۔ مسلمان اقوام کا ان کی دفاعی اور اقدامی طاقت کو مضبوط بنانے میں ہاتھ بٹانا۔
۵۔ ان خیالات کی نشر و اشاعت کی راہ میں جو بھی رکاوٹیں حائل ہوں، انہیں دور کرنا۔
۶۔ وہ جماعتیں جو مسلمانوں کے اتحاد و ترقی میں کوشاں ہیں، ان سے ربط قائم کرنا۔
۷۔ وہ غیر ملکی پارٹیاں جو انسانیت کی بہبود اور ترقی کے لئے کام کر رہی ہیں، حسب ضرورت ان سے روابط قائم کرنا۔ اور ان سے تبادلہ خیالات کرنا۔
۸۔ مسلمانوں کی بقا و حفاظت اور ان کی تجارتی، صنعتی اور معاشی ترقی کی جدوجہد کے تمام وسائل کو تقویت دینا۔

جیسا کہ ظاہر ہے "مساوات" کا یہ منشور اور پروگرام ایک معجون مرکب تھا قوم پرستانہ اور مذہبی اور سماجی نعروں کا، اور اسی وجہ سے یہ غیر واضح اور مبہم رہا۔ اور عملاً یہ جماعت آذربائیجان کی سیاست میں زیادہ مثبت کردار انجام نہ دے سکی۔

اگرچہ "مساوات" بہت جلد آذربائیجان کی سب سے بڑی پارٹی بن گئی، لیکن ملک میں متعدد ایسے گروہ بھی تھے، جو اس کے مخالف تھے۔ ایک تو شیعہ علماء جو صدیوں سے ایران کے ساتھ وابستہ تھے، وہ "مساوات کی" سُنّی ترکی سے اس بڑھتی ہوئی ہمدردی کو سخت ناپسند کرتے تھے۔ دوسرے مُلّا اور عام قدامت پسند مسلمان عوام اس جارحانہ سیکولرزم کو جو مسلم ترکی سلطنت کے حامیوں میں پائی جاتی تھی۔ تبدیل کرنے کو تیار نہ تھے۔ اس کے علاوہ خود مساوات والوں کے حلقوں میں یورپی فیشنوں کا فروغ متناقض تھا اس روایتی تصور کے، جو مسلمانوں میں عام طور سے عائلی زندگی اور عورتوں کے بارے میں تھا۔ وہ عورتوں کی برابری اور آزادی جیسی چیزوں کو بڑا خطرناک سمجھتے تھے۔ پھر نئے طور طریقوں اور یورپی ادب و آرٹ کی کشش تھیٹروں کی ہر دلعزیزی، جس کی وجہ سے نمازیوں کی تعداد کم ہوتی جارہی تھی اور عربی اور فارسی کلاسیکی کتابوں کے بجائے فرانسیسی اور جدید ترکی ادب کا مطالعہ۔ ان سب چیزوں کا اثر پرانے مسلم معاشرے پر پڑ رہا تھا۔ پگڑیوں کی جگہ ہیٹ کا رواج ہو رہا تھا۔ نئے قسم کے فرنیچر اور تصویروں سے مسلمان گھروں کی ہیئت بدل رہی تھی۔ اور روسی اور فرانسیسی یا ترکی خیالات کے زیر اثر مذہبی تصورات ختم ہوتے جارہے تھے۔ اب حالت یہ تھی کہ "مساوات" سے تعلق رکھنے والے لبرل دانشوروں کے ان دعوؤں کے باوجود، جو انہوں نے اسلام کے شاندار مستقبل کے بارے میں کئے تھے، علماء یہ دیکھ رہے تھے کہ ان لوگوں کی تجدیدی بدعات کی وجہ سے پرانا نظام اور روایات ختم ہو رہی ہیں۔ مزید براں پرانے نظام کے حامیوں کے لئے، جو مذہبی عالمگیریت کی روح اور اسلام کے بین الاقوامی اور ہمہ گیریت کے عقیدے کے جو قومی حد بندیوں سے بالاتر ہے، حامل تھے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

"پان ترکزم" کے تنگ ولانہ نسلی اور لسانی نظریئے بڑے تشویشناک تھے۔ بسا اوقات دونوں گروہوں کی یہ مخالفت کھلی دشمنی کی صورت اختیار کر لیتی، جس کے نتیجے میں علماء و ملاّ ان لبرلوں کو زندیق و ملحد قرار دیتے۔

جنگ عظیم (۱۹۱۴ - ۱۹۱۸ء) کے دوران اور اشتراکی انقلاب کے موقع پر "مساوات" کے بعض حامی آذربائیجان کلیاست کے بائیں بازو میں چلے گئے۔ سوشل ڈیموکریٹس کا گروہ "ہمت" جس سے پہلے رسول زادہ اور اس کے بہت سے متبع منسلق تھے، آذربائیجانی مزدوروں میں "مساوات" سے زیادہ ہر دلعزیز تھا۔ اور پھر سوشل ڈیموکریٹس کے مانشویک اور بالشویک میں تقسیم ہونے کے باوجود "ہمت" میں کوئی تفرقہ نہیں ہوا تھا۔

روسی سلطنت کے دوسرے حصوں کی طرح ۱۹۰۷ء اور ۱۹۱۴ء کے درمیانی عرصے میں تیز رفتار معاشی اور تعلیمی ترقی نے آذربائیجانی سماجی لیڈروں کی توجہ خالصاً سیاسی مسائل سے ہٹادی تھی، یہاں تک کہ جب پہلی جنگ عظیم میں ترکی روس کے مخالفین کے ساتھ شامل ہو گیا، تو کاکیشیا کے ان علاقوں میں بظاہر جو امن و سکون تھا اس میں کوئی فرق نہ پڑا۔

پان ترکزم کا فروغ

۱۹۰۷ء کے بعد روسی حکومت نے "ڈوما" میں ترک نمائندوں کی نشستیں کم کر دیں اور بقول مصنف، اس کی دو وجہیں تھیں۔ ایک تو یہ کہ روس کے کیڈٹس اور مزدور گروپ مسلمانوں کے تیس ارکان ڈوما سے محروم ہو جائیں۔ اور دوسرے بڑھتی ہوئی مسلم یا دوسرے لفظوں میں ترک قوم پرست تحریک کے وقار کو کاری ضرب پڑے۔" بات یہ ہے کہ ۱۹۰۵ء اور ۱۹۰۷ء کے درمیانی عرصے میں ترکوں کی روز افزوں سیاسی سرگرمیوں نے روسی حکومت کو خوفزدہ کر دیا تھا۔ اور یہ ظاہر تھا کہ یورال اور وولگا کے تاتاری روس کی تمام ترک اقوام یعنی تمام مسلمانوں کو متحد کر کے ان کی قیادت حاصل کرنے کے لئے سر توڑ کوشش کر رہے تھے۔ تاتاریوں کے مدارس، اخبارات اور ان کی کوششوں سے روسی مسلمانوں کی جو کانفرنسیں ہوئیں، ان کی کامیابی نے یہ ثابت کر دیا تھا کہ تاتار اب ایک قابل ذکر قوت ہیں، اور یہ کہ ان کی سیاست کا رخ ترکی کی طرف ہے۔

سیاسی سرگرمیوں کی راہ اس طرح مسدود پا کر ۱۹۰۸ء - ۱۹۱۰ء میں بہت سے روسی ترک لیڈر ترکی چلے گئے۔ اور استنبول ایک بار پھر روس کے پان ترکزم کے حامیوں کا مرکز بن گیا۔ ۱۹۰۸ء میں اتحاد و ترقی کے نوجوان ترک ترکی میں برسر اقتدار آ گئے۔ سلطان عبدالحمید کی پان اسلامزم کی پالیسی کے برخلاف وہ ترکوں کے اتحاد کے حامی تھے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اسی زمانے میں ترکی زبان اور ترکوں کی زندگی کو تمام مضرت بخش غیر ترکی عناصر سے پاک کرنے کی مہم کا آغاز کیا گیا۔ اور ترکی کی انجمن اتحاد و ترقی کی مرکزی کمیٹی تین مشہور ترک قوم پرست لیڈروں اسماعیل بے گسپرنسکی (کریمیا) علی بے حسین زادہ (آذر بائیجانی) اور یوسف اکچورن (تاتار) کو ارکان منتخب کیا گیا۔ اور ایک آذر بائیجانی احمد بے آغا اوگلو قسطنطنیہ کے تمام تعلیمی اداروں کے جنرل انسپکٹر مقرر ہوئے، غرض پہلی جنگ عظیم سے قبل کے پانچ چھ سالوں میں قسطنطنیہ پان ترکزم کے پروپیگنڈے اور اس سے آنے والے ترکوں کی قوتوں کو یکجا و مستحکم کرنے کا مرکز بن گیا۔

۷ دسمبر ۱۹۱۱ء کو یوسف اکچورن کا اخبار ترک یوردو (ترک یا ہائے وطن) جو پان ترکزم کا علم بردار تھا' نکلنا شروع ہوا۔ اور یہ اتنا کامیاب رہا کہ اس کے پہلے شمارے کے چار ایڈیشن، دوسرے کے تین اور تیسرے اور چوتھے شمارے کے دو دو ایڈیشن نکلے۔ اس اخبار کے تقریباً ہر شمارے میں "پان ترکزم" کی آئیڈیالوجی کا بانی اور اس کا نظریاتی ماہر احمد بے آغا اوگلو لکھتا۔ گو اوگلو اور اکچورن دونوں گسپرنسکی کے دور سے زیادہ قریب تھے، لیکن اسلام اور اس کی ثقافت کے بجائے اب ترکیت اور تورانیت تھی جو "ترک یوردو" کے بانیوں کے لئے محرک جذبہ تھا۔ اوگلو اپنے مضامین میں دنیا کی تاریخ و تہذیب میں ترکوں نے جو کارہائے نمایاں انجام دیئے ہیں، ان کا ذکر کرتا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ اگر سات آٹھ کروڑ تورانی (ان میں وہ ترکوں کے ساتھ ساتھ ایشیا اور یورپ کے منگولوں اور فن لینڈ والوں کو بھی شامل کرتا تھا) متحد ہو جائیں، تو وہ ایک بہت بڑی سلطنت قائم کر سکتے ہیں۔ وہ اسی کی ہمہ دم دعوت دیتا تھا۔ وہ لکھتا ہے:-

> ہم کہہ سکتے ہیں کہ جاپانیوں کو چھوڑ کر تمام ایشیائی قوموں میں سب سے ترقی یافتہ اور ثقافت میں سب سے آگے ترک قومیں ہیں۔

اس پان تورانزم کے داعی اور بھی بہت سے تھے، اور تورانیت کے گن گانے میں وہ ایک دوسرے سے بازی لے جانے کی کوشش کرتے تھے۔ یہ پان تورانی عرب اور عثمانی خلافت کو نظر انداز کر کے تورانی (ترکی و منگولی) ماضی سے فیضانِ روحانی حاصل کرنا چاہتے تھے۔ ان کے تاریخی ہیرو اٹیلا' اگوز خان، چنگیز خان اور تیمور تھے اور انہی کی اساس پر وہ اپنی تورانیت کا ایک تاریخی اور قومی افسانوی ڈھانچہ تیار کرنے میں کوشاں نظر آتے تھے۔ ہنوں اور منگولوں کی شاندار سلطنت کی یادیں جو کسی زمانے میں بحیرہ جاپان سے بحیرہ روم تک اور ہندوستان کے میدانوں سے شمالی روس تک پھیلی ہوئی تھی، ان کے لئے غیر معمولی کشش رکھتی تھیں۔ چنانچہ ۱۹۰۸ء - ۱۹۱۸ء

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کے درمیانی عرصے میں ان نوجوان ترکوں کے لئے ایک ایسی ہی ترک منگولی تورانی سلطنت کا دوسر نو قیام اور ایک نئی تورانی مملکت کی تخلیق، جو تمام ترکوں، منگولوں، یہاں تک کے فن لینڈ والوں پر مشتمل ہو، اور اس میں چنگیز خاں اور اٹیلا کے خانہ بدوش قبائل کے تمام علاقے شامل ہوں، جنون کی حد تک ایک ذہنی امنگ سی بن گئی۔

پان ترکزم کی یہ سیاسی ایجی ٹیشن پہلی جنگ عظیم کے موقع پر اپنے نقطۂ عروج پر پہنچ گئی۔ محب الوطن ترک اخبار نویس یہ سمجھنے لگے کہ بس اب روس ختم ہو جائے گا۔ اور اس کی جگہ تورانی سلطنت لے لے گی، لیکن جہاں تک اخبار "ترک یوردو" کے گروپ کا تعلق تھا، اس نے کھلم کھلا روس دشمن پروپیگنڈے سے اجتناب کیا۔ اور روسی حکومت نے بھی ملک میں اس کا داخلہ بند نہیں کیا۔

مختصراً حکومتِ زار کے آخری سالوں میں روسی و ترکی تعلقات کی عام طور پر کیفیت یہ تھی کہ روسیوں اور ترکوں کی باہمی مخالفت کی چند ایک مثالوں کے باوجود، صورت حال ایک حد تک اچھی ہی تھی، اور دونوں قومیں بالخصوص روسی اور تاتاری ایک دوسرے کی فرد فرد اور افادیت کو سمجھنے لگی تھیں۔ جنگ عظیم سے ذرا پہلے تاتاری سماجی اور ثقافتی لحاظ سے کافی آگے تھے اور ۱۹۱۷ء میں مسلمانوں کے مدنی (سول) حقوق روسیوں کے برابر تھے۔ ۱۹۱۲ء میں ترکی زبانوں کے مدارس کی تعداد پچیس ہزار تک پہنچ چکی تھی اور اسی سال کوئی ۴۰۸ کتابیں "اسلامی زبانوں" میں چھپیں، جن میں صرف چار میں سنسر کی زیر ہدایت کچھ تبدیلیاں کی گئیں۔ یورال وولگا کے تاتاریوں کا شہر قازان روس میں ترکی مطبوعات کا ایک بڑا مرکز تھا۔ اور ۱۹۱۲ء میں کوئی ۲۶۴ کتابیں ۲۳۲ لاکھ کی تعداد میں وہاں سے شائع ہوئیں۔ اس کے علاوہ روس کے طول و عرض سے درجنوں ترکی رسالے اور اخبار نکلنے لگے دور دراز شہروں میں مسلم خانقاہیں اور مساجد تھیں۔ زار کی افواج میں کئی مسلمان جنرل روسی جنرلوں کے ہم پایہ تھے اور اسی طرح متعدد تجارتی و صنعتی مسلمان اداروں کا شمار ملک کے دولت مند ترین اداروں میں ہوتا تھا۔

یہ ایک اجمالی نقشہ تھا، سلطنتِ زار روس کے مسلمان ترکوں کا جب ۱۹۱۴ء میں پہلی جنگ عظیم کا آغاز ہوا، دوسرے اہل ملک کی طرح روسی ترکوں نے بھی بالعموم حکومت کی تائید کا اعلان کیا۔ اور مالی امداد پیش کرنے کے علاوہ وہ فوج میں بھی بھرتی ہونے لگے۔ لیکن اس میں ظاہر ہے، کچھ مستثنیات بھی تھیں۔ روسی پولیس کے ۱۹۱۴ء ـ ۱۹۱٦ء کے ریکارڈ بتاتے ہیں کہ شمال میں کریمیا سے لے کر جنوب میں خیوا اور فرغانہ تک کہیں کہیں ترکی سے ہمدردی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کا اندر اندر پروپیگنڈہ ہوتا رہا۔ جہاں تک استنبول میں پناہ گزین روسی ترک لیڈروں کا تعلق تھا، وہ جنگ کے دوران میں بڑی مستعدی سے روس کے خلاف برسرِ کار رہے ان کے وفد آسٹریا، ہنگری اور جرمنی کے وزراء سے ملے۔ اور روس کے مقبوضہ ترک علاقوں کو آزاد کرانے کے لئے ان سے مدد چاہی۔ لیکن وہ اپنی تمام کوششوں کے باوجود روسی ترکوں کو حکومت روس کے خلاف نہ اٹھا سکے۔ البتہ جب روسی حکومت نے وسط ایشیا کے مسلمانوں کو جبراً فوج میں بھرتی کرنے کی کوشش کی تو کرغیزیا میں عام بغاوت ہوگئی، جہاں کافی کشت و خون ہوا اور کوئی تین لاکھ کرغیزی چین کے مقبوضہ حصہ کی طرف چلے گئے۔ اس ہنگامے میں دو ہزار کے قریب روسی آبادکار مارے گئے تھے۔ غرض جنگ عظیم کے دوران روس کے کسی بھی ترک علاقے میں آزادی کے لئے باقاعدہ طور پر حکومت کے خلاف کوئی اقدام نہیں ہوا۔ اور بالعموم حالات معمول پر رہے

انقلاب فروری ۱۹۱۷ء

جب روس میں فروری ۱۹۱۷ء کا انقلاب ہوا تو ملک کے ایک سرے سے لے کر دوسرے سرے تک نئی آزاد و جمہوری زندگی کی ایک لہر دوڑ گئی۔ مصنف کے الفاظ میں "اس سے قبل مشرقی یورپ کی تاریخ میں کبھی بھی اتنی تقریریں، اعلانات اور درخواستیں نہیں کی گئیں اور لکھی گئیں، جتنی کہ فروری ۱۹۱۷ء سے لے کر نومبر ۱۹۱۷ء تک کے ان افراتفری کے آٹھ مہینوں میں" روس کے دوسرے قومی گروہوں کی طرح مسلمان لیڈر بھی نومولود جمہوریت کی ڈیموکریٹک تشکیل نو کی تائید میں تھے۔ اور اس کے اندر وہ روس کے تمام مسلمانوں کی وحدت اور باہمی تعاون کا تصور کر رہے تھے۔ لیکن جب ۱۹۱۷ء میں خالص سیاسی اور قومی مقاصد کو مذہبی نعروں میں چھپا کر پیش کرنے کی کوئی ضرورت نہ رہی تھی تو اس وقت بھی روسی ترکوں اور ان کی طرح دوسرے غیر ترک مسلمانوں کو پہلے کی طرح باہم متحد رکھنے والی چیز صرف مذہب اسلام اور اس کی ثقافت تھی۔ اور کسی قومی اور نسلی پروگرام سے کہیں زیادہ موثر اور طاقتور اسلام ہی کا رشتہ ثابت ہوا۔

روسی تاریخ کے اس نازک ترین موڑ پر "مسلم سیاسی محاذ" کئی گروہوں میں بٹ گیا۔ انتہائی دائیں بازو میں علماء اور قدامت پسند تھے، جن کا شمالی کاکیشیا اور وسط ایشیا میں اب بھی کافی زور تھا۔ بیچ میں سابق "اتفاق" پارٹی کے اعتدال پسند بورژوازی لبرل تھے۔ جنہوں نے "اتحاد" کے نام سے اپنی نئی تنظیم قائم کی تھی۔ بائیں بازو میں بڑی سرعت سے سوشلسٹ گروپ وجود میں آگیا، جس کا سب سے ہر دلعزیز گروہ "مسلم برانڈ" کے سوشلسٹ انقلابیوں کا تھا۔ جو مزدوروں کے مسائل سے زیادہ قومی اور زرعی مسائل سے دلچسپی رکھتا تھا۔ انتہائی بائیں بازو میں بین الاقوامی مانشویک اور بالشویک گروپ بن رہا تھا، لیکن

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

۱۹۱۷ء کے موسم بہار میں یہ بہت کمزور تھے۔

"مسلم سیاسی محاذ" ایک تو یوں بٹ گیا۔ اور دوسری طرف ان میں یہ اختلاف بھی تھا کہ ان کے سرحدی علاقے تو جیسے کہ کاکیشیا، کریمیا، قازقستان، بشکیریا، اور وسط ایشیا کے خطے تھے، قومی علاقائی خود مختاری پر زور دیتے تھے، لیکن دوسری طرف وولگا یورال کے تاتاری اس کے بجائے تمام روسی مسلمانوں کے لئے ثقافتی خود مختاری کا اصول پیش کرتے تھے۔ جس کا کہ ایک مرکزی نظام ہو،

فروری سنہ ۱۹۱۷ء کے انقلاب کے بعد روسی مسلمانوں کی پہلی کانگریس مئی سنہ ۱۹۱۷ء میں ماسکو میں ہوئی، جس میں نوسو ڈیلی گیٹ شریک ہوئے۔ اس میں ہر خیال کے نمائندے تھے۔ اور ہر ایک نے کانگرس میں اپنا اپنا نقطۂ نظر پیش کیا تھا بقول مصنف کے :۔" اس کانگرس کے نتیجے میں جو آل روسی مسلم کونسل وجود میں آئی، وہ باہمی جھگڑوں کا اڈا بن گئی۔ روس کے دوسرے لوگوں کی طرح روسی مسلمان بھی ۱۹۱۷ء میں غیر حقیقت پسندانہ سیاسی تصورات کے عارضے کا شکار ہو گئے۔ سب کے سب آزادی اور مساوات چاہتے تھے، اور اس معاملے میں وہ اتنا آگے چلے گئے کہ ان کے ہاتھ سے سماج اور مملکت کی تشکیل کے تمام حقیقی مواقع جاتے رہے۔ جمہوری انفرادیت پسندی انارکی اور ہنگامہ میں بدل گئی۔ اصولوں یا شخصیات کی اطاعت کا کوئی خیال نہ رہا۔ اور آزادی کی محبت کے معنی تمام ذمہ داریوں اور سماجی اور ریاستی پابندیوں کا انکار ہو گیا۔"

اشتراکی انقلاب اکتوبر سنہ ۱۹۱۷ء

۲۶ اکتوبر ۱۹۱۷ء کو پیٹرز برگ میں لینن اور اس کے ساتھیوں کے ہاتھ میں اقتدار آ گیا۔ اس بالشویک انقلاب کے بارے میں روسی مسلمانوں کا رویہ تمام تر معاندانہ نہیں تھا گو بہت تھوڑے سے تعلیم یافتہ تاتاری اور آذر بائیجانی ہی مارکس اور لینن کے نظریات سے واقف تھے۔ لیکن بعض مسلمان سیاست داں بالشویکوں کے قومیتوں کی خود مختاری کے متعلق جو تصورات تھے، ان کی وجہ سے وہ ان کے حامی تھے۔

پہلی سوویت حکومت بنتے ہی لینن اور اس کے رفقا نے قومیتوں کے مسئلے کی طرف خصوصی توجہ کی۔ اور استالن جو خود سلاو نہیں تھا، اس شعبے کا سربراہ بنایا گیا۔ ۲۰ نومبر ۱۹۱۷ء کو استالن کے ایما پر حکومت نے "روس اور مشرق کے تمام مسلمان محنت کشوں" کے نام ایک منشور جاری کیا، جس میں مسلمان کامریڈوں اور بھائیوں" کو مخاطب کیا گیا تھا۔ یہ بالشویکوں کی سیاسی چال کا ایک شاہکار تھا۔ اور اس میں مارکس اور لینن کی تعلیمات کے تمام مذہب دشمن

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اور بین الاقوامی عناصر کو بالائے طاق رکھتے ہوئے مسلمانوں کے مذہبی و قومی جذبات سے اپیل کی گئی تھی۔ اس منشور کے کچھ اقتباسات یہ ہیں۔

"...... روس، کرغیز، وسط ایشیا اور سائبیریا کے مسلمانو! کاکیشیا اور ماورائے کاکیشیا کے ترکو اور تاتاریو! وہ سب جن کی مسجدیں اور عبادت گاہیں مسمار کی گئیں اور جن کے عقائد اور روایات کو زاروں اور روس کے مستبدوں نے پاؤں تلے روندا۔ آج سے تمہاری روایات و عقیدے، تمہارے قومی اور ثقافتی ادارے آزاد اور مداخلت سے محفوظ ہیں۔ تم آزادی سے اور بغیر کسی رکاوٹ کے اپنی قومی زندگی کی تنظیم کرو۔ تمہارے حقوق جیسے کہ روس کے دوسرے لوگوں کے حقوق ہیں، آج سے انقلاب کی پوری قوت اور اس کے درست و بازو مزدوروں کی سوویتوں، فوجیوں، اور کسانوں کی حفاظت میں ہیں۔ اس انقلاب کی پشت و پناہ بنو۔ یہ تمہاری خود اپنی حکومت ہے۔ مشرق کے مسلمانو! ایرانیو! ترکو! عربو! ہندوستانیو! اے سب لوگو! جن کی زندگیاں، جائدادیں، وطن اور آزادیاں یورپ کے لٹیروں کے رحم پر تھیں، جن کی زمینیں ان ڈاکوؤں نے چھین لی تھیں، اور جنہوں نے اس جنگ کو شروع کیا تھا۔ ہمارے جھنڈے دنیا کے مظلوم اور پسے ہوئے لوگوں کے لئے آزادی کا نشان ہیں"

یہ ثابت کرنے کے لئے کہ یہ اعلانات محض خالی خولی الفاظ نہیں ہیں، اسٹالن نے قرآن مجید کا ایک پرانا نسخہ جو حضرت عثمانؓ سے منسوب تھا، پیٹروگریڈ کی شاہی لائبریری سے نکلوا کر مسلمانوں کے حوالے کر دیا۔ جنوری ۱۸ ۱۹ء میں تاتاریوں کے بعض تاریخی آثار قدیمہ مقامی قومی کمیٹیوں کے سپرد کئے گئے اور اسلامی امور کے لئے تاتاری علاقے میں ایک خصوصی کمیٹی کی تشکیل عمل میں آئی۔ جس کا چیئرمین ایک تجربہ کار سوشل ڈیموکریٹ اور پرجوش انقلابی ملا نور واحتوف تھا۔ اس کمیٹی کے متعدد اور ارکان بھی تھے غرض مصنف کے الفاظ میں۔

سوویت حکومت کے ان اقدامات اور ان کے ساتھ ساتھ بڑی ہوشیاری سے جو پروپیگنڈا کیا گیا اس کے نتیجے میں مسلمانوں میں اپنی قسم کی ایک نرالی تحریک ابھری، جس میں اسلام اور مارکسزم ایک دوسرے سے مخلوط تھے۔ یہ تحریک سوویت شریعت والوں کی تھی (یعنی وہ سوویت والے جو شریعت اسلامی کے حامی ہیں) ان کا لیڈر ایک داغستانی تارکو

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

حاجی تھا۔ چیچنوں میں ایک ملاّ سلطان۔ اور کبار دینا میں کاٹ خونوف تھا
رسولوف نے وولگا یورال کے تاتاریوں میں سوویت شریعت والوں کے
پروپیگنڈے کی مہم چلائی۔

سوویت حکومت کے برسراقتدار آنے کے بعد روسی سلطنت کے مختلف علاقوں میں خودمختاری کی تحریک زور پکڑ گئی تھی۔ چنانچہ فن لینڈ، لیتھونیا، استونیا اور یوکرین وغیرہ نے فرداً فرداً مستقل مملکت ہونے کا اعلان کردیا۔" نہ صرف ان قومی گروہوں نے بلکہ خالص روسی رقبوں یا ان خطوں نے جن میں مخلوط آبادی تھی، بلکہ بعض اوقات چھوٹے چھوٹے اضلاع، یہاں تک کہ دیہات نے حق خوداختیاری کے اصول کو عملی جامہ پہنانے کے لئے بڑی سرعت سے کام لیا، تاکہ اس طرح وہ سوویت کنٹرول سے محفوظ رہیں۔

قومی خودمختاری کی جدوجہد

انہی لوگوں میں مسلمان بھی تھے، جنہوں نے اپنی قومی خودمختاریوں کا اعلان کرنے کی طرف قدم اٹھائے.... لیکن ان میں سے اکثر آزاد خودمختار ریاستیں زیادہ دیر تک قائم نہ رہیں۔ اور سوویت حکومت نے پرولتاری انقلاب کے "مفاد" کے پیش نظر اس حق خوداختیاری کو معطل کردیا۔" وولگا یورال کے تاتاری مسلمان روسی ترکوں میں سب سے زیادہ بااثر تھے، اور ان کی جو خودمختار ریاست بنی، وہ کافی مضبوط تھی۔ لیکن تاتاری قوم پرست اپنے متصل بشکیری ترکوں کے علاقے کو بھی اس ریاست میں رکھنا چاہتے تھے، جس سے دونوں میں اختلاف ہوا، اور سوویت حکومت نے اس سے فائدہ اٹھایا۔ یہ تاتاری ریاست ختم کردی گئی، اور اس کی جگہ سٹالن کی زیر ہدایت ایک تاتاری بشکیری جمہوریہ تشکیل ہوئی، جس سے تاتاری کمیونسٹ بہت خوش ہوئے۔ ان تاتاری کمیونسٹوں کا ذکر کرتے ہوئے مصنف لکھتا ہے:۔

"یہ کہنا مشکل ہے کہ یہ مسلم کمیونسٹ اپنے آپ کو مارکسٹ، انٹرنیشنلسٹ اور پرولتاری سے جو اصل مراد ہے، وہ محسوس کرتے تھے۔ بے شک انقلاب سے ان کی وفاداری صدق دلانہ تھی۔ بلکہ وہ سب سے پہلے اسے یورپی آبادکاروں کے اوپر مشرق اور بالخصوص اسلامی مشرق کی فتح سمجھتے تھے۔

۱۹۲۰ء میں ایک تاتاری مصنف نے ملاّ نور واھتوف کے حالات میں جو اسٹالن کا پہلا مسلمان رفیق کار تھا۔ (بعد میں وہ انقلاب دشمن روسیوں سے لڑتا ہوا مارا گیا) لکھا ہے۔ "ملا نور کو یقین تھا کہ عالمگیر سوشلسٹ تعمیر نو کے نتیجے میں عالمی ثقافت پر قدیم عرب ثقافت کا زبردست اثر پڑیگا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

وہ اس اسلامی ثقافت کے خواب دیکھتا تھا، جس کا اثر و نفوذ سرزمین عرب سے مقدس دریا گنگا تک پھیلے گا، اور وہ اپنی معنویت کے اعتبار سے عظیم بڑی حسین اور عمیق ہوگی۔ وہ اس کا تصور بھی نہیں کرسکتا تھا کہ اس کا زوال اور خاتمہ ممکن ہے۔ وہ یہ خواب دیکھتا تھا کہ مستقبل میں یہی ثقافت تمام انسانیت کو منور کرے گی۔ اور اسے ان باتوں کا یقین تھا۔"

ملا نور کے نزدیک جیسا کہ اس نے ۷ر مارچ ۱۹۱۷ء کو قازان میں تقریر کرتے ہوئے کہا کہ تاتاری انقلاب کا یہ تجربہ حرف آغاز ہے پورے مشرق کی عام سیاسی بیداری کا۔ اس کا کمیونسٹ نائب مشہور تاتاری ناولسٹ اور ماہر علم اللسان گلیم جان بھی مشرق اور اسلام سے اسی طرح روحانی طور پر وابستہ تھا۔ ایک اور تاتاری کمیونسٹ سلطان گالیف نے اپنے ایک سلسلۂ مضامین میں لکھا کہ تاتاری کمیونسٹ "مشرق اور اسلام کے سچے انقلابی ہیں" اور ان کے نزدیک مقدم ترین سوال عالمی انقلاب کا نہیں بلکہ یورپی "استحصال پسندی" کی زنجیروں سے مشرق کو آزاد کرانا ہے۔

اسٹالن، جس نے اس زمانے میں ان تقریروں اور تحریروں کی حوصلہ افزائی کی تھی، اچھی طرح جانتا تھا کہ مسلم کمیونسٹوں کی آئیڈیالوجی اور مقاصد یورپی کمیونسٹوں سے بہت زیادہ مختلف ہیں" لیکن ۱۹۱۸ء کے نازک دنوں میں بالشویکوں کو جہاں سے بھی مدد ملتی تھی وہ اسے قبول کرلیتے تھے۔ وہ ہر اس شخص کو حلیف بنانے کے لئے تیار تھے، جو بین الاقوامی انقلاب کا حامی ہوتا، اور وہ سفید روسی افواج اور سابق کمیونسٹ دشمن قوم پرست روس کے آخری نمائندوں سے لڑنا چاہتا تھا۔ اس لئے بائیں بازو والوں کی مخالفت نیز خود اپنے ان تاتاری حلیفوں پر عدم اعتماد کے باوجود اسٹالن نے ہر طرح سے ان کی مدد کی۔"

۱۰-۱۶ر مئی ۱۹۱۸ء کو اسٹالن نے مسلم کمیونسٹوں کی ایک کانفرنس بلائی، اس میں خود افتتاحی تقریر کی اور اس طرح تقریباً ایک کروڑ آبادی پر مشتمل ایک تاتاری بشکیری خود مختار جمہوریہ کا قیام عمل میں آیا۔ اس پر ملا نور نے بڑے خلوص سے ان جذبات کا اظہار کیا:-

ہم کامریڈ لینن اور اسٹالن کے بے حد شکر گزار ہیں کہ انہوں نے یہ سمجھا ....مسلم پرولتاری کی آرزوؤں کی تکمیل ایک شاندار انقلابی کارنامہ ہے

اس کانفرنس سے چند دن ہی بعد پورے مشرقی روس میں خانہ جنگی (سول وار) شروع ہوگئی اس سلسلے میں "مسلم مزدوروں" اور کسانوں" کی سوویت مسلم فوج بنائی گئی اور ملا نور نے اپیل کرتے ہوئے لکھا کہ "اس خطرے کے وقت مسلم پرولتاریہ کو سوویت جمہوریہ کے دفاع

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کے لئے اٹھ کھڑا ہونا چاہیئے" اسی کشمکش میں ملا نور ۱۹ اگست ۱۹۱۸ء کو مارا گیا۔

ترک قومیتوں میں کشمکش

۱۹۱۷ء کے انقلاب سے قبل بشکیریوں[1] اور تاتاریوں میں کوئی خاص مخاصمت نہیں تھی، لیکن انقلاب کے بعد بشکیری لیڈروں نے بھی اپنی ایک مخصوص قسم کی قومیت کا مظاہرہ کرنا شروع کردیا ان کا سب سے بڑا مسئلہ زمین کا تھا، اور وہ ان تمام آبادکاروں کے خلاف تھے اپنے مسلمان تاتاری بھائیوں سمیت، جو باہر سے آکر ان کی زمینوں پر آباد ہوگئے تھے۔ چنانچہ مئی ۱۹۱۷ء میں (فروری انقلاب کے بعد اور اشتراکی انقلاب اکتوبر سے قبل) ماسکو میں جو پہلی آل روسی مسلم کانگرس ہوئی تھی اس کی اس قرارداد سے کہ "ساری زمین لوگوں کی ہے" بشکیری خوش نہ تھے۔ وہ اس پر مصر تھے کہ "بشکیریا کی ساری زمینیں صرف بشکیریوں کے لئے ہیں" اس پر جولائی ۱۹۱۷ء میں پہلی آل بشکیری قومی کانفرنس وجود میں آئی، جس کا روح رواں ایک فعال سیاست داں احمد زکی ولیدوف تھا۔ پوری بشکیری قومیت کی تحریک بہت حد تک اس کی کوششوں کا نتیجہ تھی، اور اگر یہ نہ ہوتا تو تاتاری بشکیری کشمکش[2] اتنی شدت اختیار نہ کرتی اس کے ایماء پر اس بشکیری کانفرنس میں قومی علاقائی خود مختاری، بشکیری فوجی یونٹ بنانے اور ۱۹۱۸ء کے بعد وہ تمام زمینیں جو آبادکاروں نے لی ہیں، وہ واپس بشکیریوں کو لوٹانے کا مطالبہ کیا گیا۔ اس کانفرنس نے یہ بھی اعلان کیا کہ بشکیری لسانی خصوصیات کی بنا پر دوسرے مسلمانوں سے جو بشکیریا میں آکر آباد ہوئے ہیں، ظاہر ہے اس سے مراد تاتاری تھے، مختلف ہیں، اور یہ مزید اثبات تھا اس امر کا کہ وہ تاتاریوں سے الگ رہنا چاہتے ہیں۔ (مسلسل)

---

[1] بشکیری بھی ترک تھے اور تاتاریوں سے نسلاً بہت زیادہ قریب تھے، فرق صرف یہ تھا کہ تاتاری زمینوں پر آباد تھے کسان تھے اور بشکیری نیم خانہ بدوش [2] ان میں اختلاف سماجی اور ثقافتی بنیادوں پر تھا، وہی خانہ بدوشوں اور کسانوں کا فطری اختلاف، تاتاری بشکیریوں کو اپنے ہی خانہ بدوش اور پس ماندہ قبیلے سمجھتے تھے، اور ان کا یہ رویہ بشکیری سیاست دانوں اور سرداروں کو سخت ناپسند تھا۔

© rasailojaraid.com